

”اور— ”پیار کا پہلا شر“ کی پاسکل —

”میں مستنصر حسین تارڑ کی کتاب پر ایسے جھٹی جھیسے کوئی دس روز کا بھوکا آدمی روٹی پر جھٹتا ہو۔ میں پورے چھ فینے اس سے لطف اندوں ہوتی رہی۔ پہلے میری ساری دلچسپی زبان سے بندھی ہوئی تھی۔ مگر پڑھتے پڑھتے دلچسپیوں کا مرکز بدلتے لگا۔ میں ایک حاس شخص سے اس کی اندر ونی دنیا اور اس کی آنکھوں سے دیکھی ہوئی باہرواں دنیا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ خاص طور پر اس دنیا سے جماں پاسکل جیسی پیاری، نازک اور بد قسمت لڑکی رہتی ہے۔ میں بھی عورت ہوں اور مجھ پر اس کمانی کا برا اثر ہوا۔ ماسکو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے طلباء بھی پاسکل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ یہ اس بات سے ظاہر ہے کہ سنپر کو (اس روز تارڑ کی کتاب پڑھائی جاتی ہے) کوئی طالب علم پیاری، کسی رشتہ دار کی آمد یا دوست کی شادی کا بمانہ کر کے غیر حاضر نہیں ہوتا۔ اس بات کے باوجود کہ کسی دوسرے دن کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سارے روس میں کوئی وبا پھیل گئی ہو یا اس طالب علم شادیاں کرنے والے ہوں۔ اس کے علاوہ ہر طالب علم روی زبان میں اچھا ترجمہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“

گالیتا ڈشکو

سینٹر پروفیسر شعبہ اردو، ماسکو یونیورسٹی روس

سینہ رات کی تاریخی میں رو بار انگلستان کی سردا اور بھری ہوئی موجودوں کو چیرتا فرانس کی بندگاہ ڈنکرک کی جانب روائی تھا۔ انگلستان اور فرانس کے درمیان پھیلا ہوا چھتیں میں کایہ سمندر جو عام طور پر بے حد پر سکون ہوتا ہے آج کی شب تلاطم میں تھا۔ گھپ اندر ہرے میں لروں کا بے پناہ شور اور تیز ہوا کسی بڑے طوفان کا پیش خیما تھی۔ تند لہریں سمندر کے سینے میں سے اپنا میب وجود ابھارتیں اور ایک خوفناک دھماکے سے سینہ سے آنکراتیں۔ انکراوے سے سینہ کسی بوڑھے شرابی کی طرح ایک دم لوكھڑا جاتا اور پھر اسی لمحے ایسے پر سکون ہو جاتا جیسے اس شرابی نے دور سے آتے ہوئے کسی پولیس کے سپاہی کو دیکھ لیا ہو۔ مگر یہ سکون دیریا ثابت نہ ہوتا اور سینہ ایک مرتبہ پھر ہچکو لے کھانے لگتا۔

نان اسی سینہ پر لٹڑن سے پیرس جا رہا تھا۔

انگلستان کے ساحل پر ڈودور شرے متصل مشہور زمانہ سفید چٹانیں جو اندر ہرے میں فیالی لگ رہی تھیں آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھیں۔ چٹانوں کے پلو میں ڈودور کے قدیم قلعے کے سنگلاخ درو دیوار کی پر چھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ قلعے کے درمیان بلند چبوتروں کو برتی روشنی سے منور کیا گیا تھا۔ لروں کے شور اور گھپ اندر ہرے میں قلعے کے برجوں میں سے پھوٹتی ہوئی بلکی روشنی میں ایک میب اور سیاہ تم کی خوبصورتی تھی جیسے وہ آسیب زدہ ہوں۔

ڈودور کی سفید چٹانیں اور قدیم قلعہ صدیوں تک انگریزوں کے ملکوم ممالک سے آئے والے باشندوں کے لیے مادر وطن انگلستان کی پہلی جھلک ہوا کرتے تھے جنہیں

دیکھ کر ان غلام روحوں پر وجد طاری ہو جاتا۔ سرکار برطانیہ جس کی سلطنت پر بھر سورج غروب نہ ہوتا جو سمندر کی لہروں پر بھی حکمران تھی۔ اس عظیم سرکار کا دارالسلطنت لنڈن کا دروازہ ڈور! ان دونوں انگلستان ایک تک چڑھی تھی جبکہ جنگ بڑھا کی مانند تھا جس کے قیمت گئنے غلام قوموں کے خون پینے کا شر تھے۔ اور پھر ان ملکوں کے حریت پسند آگے بڑھے اور وہ تمام گئنے نوچ لیے جو اس بوڑھی جزا نے تندیب کے نام پر ان کے بزرگوں سے تھیا لیے تھے۔ ہر زیور کے چھٹے پر بڑھا بری طرح جنمبلہ اٹھتی اور وہ ایک خوست آلوں عفریت کا روپ دھار لیتی۔ اُج آج یہ بڑھا بے حد پر سکون ہے۔ اس نے حالات سے سمجھوٹہ کر لیا ہے۔ عظیم ماں کی یاد اب صرف قسم شراب خانوں میں بیٹھے بڑھے کھوٹ انگریزوں کی بے رہا گفتگو تک محدود ہے۔ آج ڈور کا قلعہ اور سفید چٹانیں، ایک گم گشتہ تندیب کا پرچھائیاں ہیں جنہیں دیکھ کر صرف ان کا جمال دل پر اڑ کرتا ہے نہ کہ ان کا جلال۔ سنان بھی اس مرتبہ انگلستان کے ساحل پر ڈور کے طلسمی قلعے اور سفید چٹانوں کو نظروں سے او جھل ہوتے دیکھ کر جذباتی طور پر غیر متاثر رہا۔ اس کی وجہ شاید بھی تھی کہ ہسپانیہ اور اس کے درمیان فاصلے کم ہو رہے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ شب پریس میں بس رک کے سیدھا غرباط (ہسپانیہ) کے لیے روانہ ہو جائے۔ ڈور کا قلعہ اور اس کے برجوں میں منور روشنیاں اب صرف ایک روشن گولے کی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔ سفید چٹانیں مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب چکی تھیں۔ سنان نے مختلف سمت میں فرانس کے ساحل کی جانب دیکھا۔ وہاں صرف تاریکی تھی۔ ڈکر کا شرکوسوں دور تھا۔

سنان نے خنکی سے بچاؤ کی خاطر اپنی سفید برساتی کا کار گلے کے گرد پیٹ لیا اور اپنی طویل سیاحت کے بارے میں سوچنے لگا۔ ابھی چھ ماہ پہلے کی تو بات تھی جب وہ لاہور میں اپنے کمرے میں بیٹھا دنیا کے نقشے پر سرخ پنسل سے لکیریں کھینچ کر اپنے سفر کا خاکہ تیار کر رہا تھا۔ اور پھر۔ خنکی کے راستے یہ سفر شروع ہوا۔ انگلستان

ایران، ترکی، بلخاریہ، یوگو سلاویہ، آسٹریا، اطالیہ، سوئیز لینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، ہاروے، ہائینڈ اور پلیمیٹ سے ہوتا ہوا وہ انگلستان پہنچا تھا۔ اس طویل سفر نے اسے تمکا دیا تھا۔ لندن سے روانہ ہوتے وقت اسے احساس ہوا تھا کہ اب اس کے سفر کا اختتام ہونے کو ہے۔ فرانس اور ہسپانیہ کی سیاحت کے بعد وہ گمراہی میں میں چل کرزا ہو گا۔ اس کا پیارا گھر جہاں اس کی شخصی منی بہنیں اور مشقہ والدین اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ تو کسی صورت اسے اس طویل سفر پر نکلنے کی اجازت ہی نہ دیتے تھے۔

”بیٹھے تم اجنبی دیوں کی خاک چھانو گے۔“ اس کے باپ نے کہا تھا ”انجمنی را ہوں کے سافر ہو گے۔ جانے ان دیوں میں تمہیں کیا کیا مشکلات پیش آئیں اور پھر۔ تمہارے ساتھ کوئی حادثہ ہو جائے تو؟۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھر گئی تھی۔

”حادثہ کمال نہیں ہو سکتا ابا جان۔“ اس نے نہ کہا تھا۔ ”یہاں ہمارے گھر کے سامنے ہال روڑ پر سڑک پار کرتے ہوئے بھی تو ہو سکتا ہے۔“

مال خاموش رہی لیکن اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی گھری ادا سی اس بات کا پتا دے رہی تھی کہ وہ بھی اپنے جوان بیٹھے کے شوق سیاحت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ چلتے وقت مال نے اس کا بازو تھام لیا۔ ”بیٹھے اپنا خیال رکھنا، اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں یہاں اپنے باورچی خانے میں بیٹھی مر جاؤں گی۔“

اس کے عزیز ترین دوست فخر نے کہا تھا ”سنان تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم کبھی بھی کامیاب انسان نہیں بن سکتے۔ چھ ماہ کی غیر حاضری سے تمہارے کاروبار کا ستیا نا اس ہو جائے گا۔ میں تو کہتا ہوں اب بھی اپنا ارادہ بدلت ڈالو۔ آؤ شیزان میں چائے کی ایک پیالی پی کر کیسی قلم دیکھتے ہیں۔“

سنان جواب میں صرف مسکرا دیا تھا۔ ”ہاں کسی ہوٹل میں چائے کی پیالی۔ مال روڑ کے بے مقصد چکر اور پھر شام کو ٹیلی ویرین کے سامنے اوگننا ہی ان لوگوں کے

لے کامیاب زندگی ہے۔” اس کے سامنے تو قوس قزح کے تمام رنگ بکھرے پڑے تھے۔ ابھی اتفاق اس کی زد میں تھے۔

ہاں البتہ اس کی پیاری بہنیں بالکل معرض نہ ہوئیں۔ ”بھائی جاننا ہے کارن بی شرپٹ لنڈن میں لیڈریز کوٹ بے حد عدہ ملتے ہیں۔ ایک میرے لئے لے آئے گا۔ پلیز!“

”ایک میرے لئے بھی۔“ بخالی نے گردہ دی۔

”میں بھی پہن لوں گی“ سب سے چھوٹی نے اپنی لامبی ٹلکیں جھپکتے ہوئے شرارت سے کما تھا۔

لنڈن میں قیام کے دوران میں اس نے اپنے لیے تو کچھ نہ خریدا، البتہ بہنوں کے لیے کوٹ ضرور خرید لیے۔ بھلا ان تینوں کے لیے ولایت سے کوئی تحفہ نہ لے جا کر ساری عمر جلے ہوئے ٹوٹھ اور بیٹھکن کدو جیسی بزیابی کون کھاتا!

شان سوچ رہا تھا کہ یہ سیئرہ سے صبح تک فرانس کی بند رگاہ ڈنکرک لے جائے گا۔ وہاں سے گاڑی میں سوار ہو کر شام تک پیرس، شب بسری کے بعد دوسری صبح تھا۔ وہ غرناطہ اور قربطہ کے پرفسوں شروں کی طرف چل دے گا جہاں کی محابوں اور ایوانوں نے اسے ڈوری میں باندھ رکھا تھا۔ بچپن میں جہازی قسم کے ناول پڑھ پڑھ کر اس کے دل میں ان شروں کو دیکھنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہاں جا کر دیکھے کہ کیا اب بھی وہاں چشم غزال عام ہے اور نگاہوں کے تیر واقعی دل نہیں ہیں۔ اب گرمیوں کا آخر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موسم خزان کا شروع اندرس کی سرزمین میں بس رکر کے شدید سردی شروع ہونے سے پہلے پہلے واپس وطن لوٹ جائے ورنہ ترکی میں برف باری کے طوفانوں میں گھر جانے کا اندیشہ تھا۔ ویسے بھی وہ اس طویل سفر سے آتا چکا تھا اور جلد از جلد وطن لوٹنا چاہتا تھا۔

ایک تیز و تند لہر سیئرہ سے نکرائی اور سمندر کا نمکین پانی پھوار کی صورت میں شان کے چہرے پر پھیل گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر منہ پوچھا اور ادھر ادھر

نظر دوڑائی۔ نم آکو عرشہ ویران پڑا تھا۔ تمام مسافرات کی خلکی اور سمندر کی نم آکو ہواں سے بچاؤ کی خاطر سینر کی چلی منزل میں واقع قبوہ خانے میں جا چکے تھے۔ ہوا ب اب تدرے تیز ہو چلی تھی اور اس کی خلکی بر ساتی میں سے جذب ہو کر اس کے چوڑے چکلے سینے کو ٹھکر رہی تھی۔ سنان نے اپنا مختصر سامان اٹھایا اور قبوہ خانے کو اترنی ہوئی سیڑھیوں کی جانب چل دیا۔

قبوہ خانہ کمچا کمچ بھرا ہوا تھا۔ یہاں پر لمبیوں کے شور کی بجائے انسانی آوازوں کا غمغا تھا۔ چند لوگ کافی یا شراب پینے میں معروف تھے مگر اکثریت کرسیوں پر ٹالکیں پھیلائے اونگھنے اور سونے کے درمیانی مراحل میں تھی۔ دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے ایک بوڑھا انگریز سیاہ سوت اور باڈل ہیٹ میں لمبوس ایک ہاتھ میں چھاتا تھا۔ اس د حرکت کھڑا تھا۔ اسے شاید فرش پر کوٹ بچھا کر لیئے ہوئے ایک نوجوان جوڑے کی حرکات دیکھنے سے سکتے طاری ہو گیا تھا جو پیرس چکنے کا انتظار کئے بنتہ وہیں فرانسیسی رومان پسندی کا پہلا سبق رئنے میں ہمہ تن معروف تھا۔ ایک جانب چند نوجوان انگریز موسیقار اپنے قد آور سازوں سے ٹیک لگائے اونگھ رہے تھے۔ وہ شاید جس شرت کے متین تھے انہیں لندن میں نہ مل سکی تھی اور اب وہ پیرس کا رخ کر رہے تھے۔ پیرس جہاں ہرفن کار کی قدر ہوتی ہے وہ موسیقار ہو یا مصور۔ سنان نے ایک نظر اس بے ترتیب ہجوم پر ڈالی اور پھر میزوں، کرسیوں اور انسانی جسموں میں سے راستہ بناتا کاؤٹر تک پہنچ گیا۔

”ایک پیالی کافی“ اس نے اپنی گیلی بر ساتی اتارتے ہوئے کاؤٹر کے پیچے کھڑے دیٹر سے کما ”اور ہاں“ اس نے جلدی سے ترمیم کی ”کافی بلیک ہو جیٹ بلیک“ بینر دوڑھ کے۔

ویرنے سرہلایا اور کچھ کے بغیر مشین کا ہینڈل گھما کر کافی تیار کرنے لگا۔ ”کافی؟“ کاؤٹر کے ساتھ اوپنجی کرسی پر راجحان ایک پستہ قدسکاث نے اپنی مخمور آنکھیں سنان پر جمادیں۔ اس کے سامنے شراب کا ایک گلاس دھرا تھا۔ ”شراب پیو

لڑکے!“ سنان نے سکاث پر ایک نظر ڈالی اور پھر ویٹر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”میر کافی میں چینی بھی پسند نہیں کرتا۔“

”پھر کافی؟“ سکاث نے بدک کر کہا۔

سنان خاموش رہا۔

سکاث نے اس کے کوٹ کا کارپوڑ کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ”میر نے کافی شراب پیو۔ کافی تو عورتوں کا مشروب ہے۔“

”میں شراب نہیں پیتا“ سنان نے آکتا ہٹ سے کہا۔

”میں پلا دیتا ہوں“ سکاث مصر ہو گیا۔

”کہہ جو دیا کہ میں — شراب — نہیں پیتا“ سنان نے فتح سے کوٹ کا الہ چھڑاتے ہوئے کہا۔

”میں پیتے تو بے حد کوڑ ذوق ہو۔ میں تو تمہارے بھلے کی بات کر رہا ہوں۔“
یہاں سیٹر پر نیکس فری ہے اور آدمی قیمت پر ملتی ہے“ سکاث نے لرزتے ہاتھوں سے کاؤٹر پر رکھا شراب کا گلاس اٹھایا اور منہ سے لگا کر غٹاغٹ پی گیا۔ ویٹر نے جو شبلہ اسی انتظار میں تھا کافی میشین کا ہینڈل چھوڑ کر الماری میں سے بوتل نکالی اور گلاس ہم سے لباب ببر دیا۔ بوتل الماری میں واپس رکھ کر وہ پھر کافی بنانے میں مشغول ہو گیا۔
”میں تو ہر ہفتے فرانس کا چکر لگا آتا ہوں“ سکاث نے گھونٹ بھر کر جھومنتے ہوئے کہا۔

”آپ کی وہاں رشتہ داری ہے کیا؟“ سنان نے یونہی پوچھ لیا۔

”رشتہ داری؟“ سکاث نے ایک بے ہنگم قتفہ لگایا“ سکاث لینڈ کے باشندوں کا رشتہ داری صرف سکاچ و ہسکی سے ہوتی ہے۔“

زیادہ پی گیا ہے کم بخت۔ سنان نے اندازہ لگایا اور خاموش کھڑا رہا۔

”در اصل رات کا سیٹر صبح تک فرانس پہنچ جاتا ہے میں وہاں سارا دن کسی فوا خانے میں بیٹھ کر بوردو اور کونی ایک ملعون میں اگائے جانے والے انگوروں کا

شراب سے ٹھاکھتا ہوں اور دوسرا شب واپس انگلتان آ جاتا ہوں۔ سیمیر کا دو
ملزد کرایا اسی کری پر بیٹھ کر سستی شراب پی کر ہی پورا کر لیتا ہوں۔“

”مہبٹ خوب“ نان نے طنزیہ انداز میں داد دی ”اور جناب نے سیدھی سادی
پہنچن کی بجائے یہ لڑکیوں کا لباس سکرت کیوں پہن رکھا ہے؟“
”لڑکیوں کا لباس؟“ سکاث نے اپنے چار خانے والے رنگ دار اونی سکرت کی
طرف دیکھ کر جیرانی سے کہا۔

”سکرت لڑکیاں ہی تو پہنچتی ہیں“

”ہو ہو۔ نہیں نہیں“ سکاث نے پھر ایک زور دار تقصیہ بلند کیا ”یہ تو سکاث
لینڈ کے جری مرونوں کا روایتی لباس کلٹ ہے۔ ہمارا قوی ہیرو روب رائے بھی یہی پہنا
کرتا تھا۔“

”یہ روب رائے سکاث لینڈ کا تھا کیا؟“

”سوئی صد سکاث۔“

”نام سے تو ہندو گلتا ہے“ نان نے بناولی حیرت سے کہا۔

”تمہاری معلومات نہایت ناقص ہیں“ سکاث نے گلاس پھر غالی کر دیا اور اپنے
کلٹ کو گھنٹوں پر پھیلاتے ہوئے کہنے لگا ”ویسے یہ لباس ہے بڑے کام کی چیز صرف
تینز ہوا چلے تو مصیبت کمری ہو جاتی ہے۔“

”تو آپ لوگ اسے پہننے ہی کیوں ہیں؟“

”میں تو صرف اس لیے پہنتا ہوں کہ فرانسیسی عورتیں اسے بے حد پسند کرتی
ہیں۔ ندا ہو جاتی ہیں بس!“ سکاث نے اپنا بدبو دار منہ نان کے پاس لا کر بڑے راز
وارانہ لمحے میں پتایا اور پھر مسکرا کر کہنے لگا ”ویسے فرانسیسی عورتوں کے بارے میں
تمہارا کیا خیال ہے؟“

”کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا“

”کافی سرا!“ دیش نے سفید جھاگ سے بھر پور کافی کی پیالی نان کے آگے رکھ دی۔

سنان نے کافی کے پیسے ادا کر دیئے۔ پست قد سکاٹ جس کی ذی ہوشی کی عمر اب تک ہونے کو تھی اس قابل نہ تھا کہ اس کی رفاقت میں بقیہ سفر خوش گوار طریقے سے کر سکے۔ چنانچہ سنان نے کافی کی پیالی کاؤنٹر سے انھالی اور پیچھے مڑا۔ اسے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں بیٹھ کر وہ اطمینان سے کافی پی سکے اور ہو سکے تو بقیہ سفر کے دوران میں تھوڑا بہت اوپنگ بھی لے۔ قبوہ خانے کی تمام میزیں پر تھیں۔

”کیوں نہ واپس عرش پر علی چلا جائے“ سنان نے سوچا ”وہاں خنکی کے باوجود سکون تو ہو گا“ اور بر ساتی دوبارہ پن کر قبوہ خانے دروازے سے باہر نکل گیا۔

نان اور عرش پر آیا تو وہاں اب بھی ویرانی کا راجح تھا۔ البتہ طوفان کی شدت میں کی واقع ہو چکی تھی اور سینیر نمایت پر سکون انداز میں فرانس کے ساحل کی جانب پڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سینیر کے گرد بننے ہوئے آہنی چلکے کے اوپر بندھے ہوئے رے پر دو بلب جھول رہے تھے جن کی مدھم روشنی عرش کے بھیگے ہوئے تختوں پر چک رہی تھی۔ کیبین کی دیوار کے ساتھ خالی آرام کرسیوں کی ایک قطار تھی۔ نان وہیں ایک کری پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سکرٹوں کا پیکٹ نکلا اور ایک سکرٹ سلاکا کر منہ میں دبا لیا۔ اس نے پہ مشکل ایک دو کش ہی لگائے ہوں گے کہ بظاہر پر سکون سمندر میں سے ایک تند موچ اٹھی اور سینیر کے ساتھ آنکھ رائی، سمندر کا نمکین پانی اس کے پورے چھرے کو بھگو گیا۔ سکرٹ بجھ گیا۔ نان زیر لب بڑبڑا یا اور پھر گیلے سکرٹ کو عرش پر پھینک کر کافی پینے میں مشغول ہو گیا۔ اس نے ایک چکی لگا کر رسول سے جھولتے ہوئے تختوں سے پرے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہاں صرف اہوں کا شور اور کمل تاریکی تھی۔

تحوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ عرش پر اکیلا نہیں بلکہ ساتھ والی کری پر ایک اور مسافر موسم کی سختیوں سے بے نیاز ٹانگیں پھیلائے سو رہا ہے۔ اس نے سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو ایک بھاری سرخ کوٹ سے ڈھک رکھا تھا۔ ایک دم سینیر کا کھیلایا ہوا بھونپو زور سے بجا۔

”اوہ کتنی سردی ہے۔ ہو ہو۔“

یہ سرگلی اور ٹھھرتی ہوئی آواز ساتھ والی کری پر پڑے سرخ کوٹ میں سے آئی

تھی۔ سنان نے بوکھلا کر کافی کی پیالی عرش پر رکھ دی۔

”ہو ہو“ سرخ کوٹ اب باقاعدہ خشن رہا تھا۔

جواب تو سننا چاہیے۔ سنان نے سوچا۔

”آپ کو کس بھلے مانس نے اس سروی میں عرش پر سونے کا مشورہ دیا تھا؟“

اس نے اپنا منہ کوٹ کے اس بٹن کے پاس لے جا کر زور سے کما جس کے اس پاس سریلی آواز کے کان ہو سکتے تھے۔

”اوہ“ کوٹ ایک دم اچھل پڑا۔

کالر کے سرے پر دو خوفزدہ آنکھیں جھانکنے لگیں ”تم کون ہو؟“

سرخ کوٹ نے یہ سوال ایسے ہی پوچھا تھا جیسے عامل معمول کے درمیان مکالمہ میں ”تم کون“ پوچھا جاتا ہے۔

”مسافر“ سنان نے ”نامول“ کی بھر میں جواب دیا۔

مدھم روشنی میں وہ صرف اتنا دیکھ سکا کہ عامل لڑکی ہے اور بال لڑکوں کی طرز پھوٹے چھوٹے کئے ہوئے ہیں۔ خوبصورت بھی ہے۔

آنکھیں جو خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئیں۔ کافی بڑی تھیں۔

”نیچے قوہ خانے میں جگہ نہ تھی اس لیے یہاں آ کر سوری۔ میرا تو وہاں دم گھٹ رہا تھا۔“ سرخ کوٹ نے آہستہ سے کہا۔

ساناب اس انتظار میں تھا کہ سرخ کوٹ آنکھوں سے نیچے ڈھلنے اور وہ اس کے بقیہ خدوخال دیکھ سکے۔ آنکھیں اب آہستہ آہستہ نیند کے بوجھ سے بند ہو رہی تھیں۔

”آہم“ سنان نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا ”اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اپنا بر ساتی دے سکتا ہوں۔ سرخ کوٹ پر پھیلا لیجئے پھوار سے بچاؤ ہو گا۔“

”ادنہوں“ سرخ کوٹ نے صاف انکار کر دیا اور پھر اونکھنے لگا۔

نان کو نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ لڑکی سو گئی تو صحیح یونی ہم سم ہو کر بیٹھا رہتا پڑے گا۔ گفتگو جاری رہتی چاہئے۔
لہیا آج واقعی بے حد سردی ہے؟“ اس نے بات کو طول دیتے ہوئے خوش دلی

سے پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں صرف مشغله کے طور پر غلظت رہی ہوں؟“ کوٹ نے رکھائی سے جواب دیا۔

نان نے منہ بنا لیا۔ عجیب لڑکی ہے بات کرنے کی بھی تیز نہیں۔

یورپ میں کالی آنکھیں، کالے بال اور مشرقی خدوخال لڑکیوں کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ جن مشرقی لڑکوں کی شکل و صورت کے بارے میں ان کے والدین کو بھی کوئی خوش فہمی نہیں ہوتی وہ بھی یورپ میں جا کر لڑکیوں سے ”ہندسم سڑنیخبر“ یعنی خوش شکل اجنبی کا خطاب پا جاتے ہیں۔ اور نان تو ویسے ہی مشرقی وجاہت کا بھرپور نمونہ تھا۔ بڑی بڑی کالی بھور آنکھیں، یکدم اداس اور پل بھر میں مسکرا دینے والی، ستواں ناک، چوڑا ماٹھا اور مناسب جسم۔ اگرچہ یورپ میں نان نے ان مردانہ صفات سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا مگر اس سرخ کوٹ نے اس لڑکی نے اس کی اناکوٹھیں لگائی تھی۔ بھلا سیدھے منہ بات کیوں نہیں کرتی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی اور بڑے تحمل سے پوچھا۔

”آپ انگریز ہیں کیا؟“

”تم کو افریقی لگتی ہوں کیا؟“ سرخ کوٹ نے اوپنگتے ہوئے پھر جھاڑ پلا دی اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر جہانی لیتے ہوئے پوچھا ”فرانس جا رہے ہو؟“ چرے پر بلا کا بھوپن تھا۔

”اور نہیں تو کیا یہ سیئر افریقہ جا رہا ہے؟“ اب نان کی باری تھی ”ظاہر ہے اس سیئر پر سوار تمام مسافر فرانس ہی تو جا رہے ہیں۔“

لڑکی نے قربھری نظریوں سے نان کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمبی ”اومنہ“ کر

کے اپنا کوٹ آنکھوں پر بھینچ کر خاموشی سے آرام کری پر لیٹ گئی۔

سان مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے فرش پر رکھی کافی کی پیالی اٹھا کر منہ سے لگائی۔ کافی بالکل بخ ہو چکی تھی۔ اس نے پہ مشکل ایک گھونٹ لگلا اور پیالی دوبارہ فرش پر رکھ کر انگلیاں چٹانے لگا۔ اب کیا کیا جائے؟

ساتھ والی کرسی پر لیٹا سرخ کوٹ بالکل بے حس و حرکت تھا۔

اسے احساس ہوا کہ اس کا رویہ نہایت غیر معقول اور انتہائی غیر دوستانہ تھا۔ زیادتی بمرحال اس کی اپنی تھی۔ بھلا مزے سے سوتی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی کے کان میں اس طرح تان لگا دنما کماں کی شرافت ہے۔

معدرت کرنی چاہیے۔ سان نے فیصلہ کیا۔

”ہیلو!“ اس نے کوٹ کے کالر سے مخاطب ہو کر سرگوشی کی۔

کوٹ ساکن پڑا رہا۔

”میں نے کہا۔ ہیلو!“ سان نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

”اوہ! کیا مصیبت ہے سونے بھی دو گے یا نہیں“ کوٹ ایک دم ہڑپدا کر انہوں بیٹھا۔

وہ نہایت بڑھم نظر آ رہی تھی۔

”میں دراصل آپ سے — میرا مطلب ہے کہ مجھے بے حد افسوس ہے مٹا لے آپ کو خواہ مخواہ ڈرا دیا“ سان کے لمحے میں معدرت تھی۔

”ایک بار نہیں بلکہ دو مرتبہ“ لڑکی نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر نسخے بچوں کی مانند اپنی آنکھیں ملیں۔

”آپ فرانس جا رہی ہیں؟“ سان کے منہ سے بے اختیار وہی جملہ نکل گیا جس پر اس سے قبل ہنگامہ ہو چکا تھا۔

”اور نہیں تو کیا یہ سیئر افریقہ جا رہا ہے؟ ظاہر ہے اس سیئر پر سوار تمام مسافر—“ اس نے انگلیاں نچا کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور خود بخود مسکرانے لگی۔

اس وقت سنان کا مجی چاہا کہ کاش اس کے پاس بھی کوئی سرخ کوٹ ہوتا تھا وہ
جو اب ایک لمبی "اوونہ" کر کے اسے اوڑھ کر وہیں کری پر لمبا پڑ جاتا۔
میں صرف معدرت کرنا چاہتا تھا" سنان اپنی خفت مٹانے کی خاطر جیب سے
سگرٹ نہال کر سلکانے کی کوشش کرنے لگا۔ سمندر سے اب بھی ہلکی ہلکی پھوار ان
کے چروں پر پڑ رہی تھی اس لیے سگرٹ نہ چل سکا۔
اور کچھ؟" لڑکی نے کوٹ کا کالر آنکھوں سے سراکار نیچے کر لیا۔ واقعی وہ
خوبصورت تھی۔

"کچھ نہیں" سنان نے جھلا کر سگرٹ پھینک دیا "اب آپ سو سکتی ہیں میں ہرگز
خل نہیں ہوں گا۔"
تقریباً ایک گھنٹے تک ہمیں فرانس کے ساحل کی پہلی جھلک دکھائی دینے لگے گی"
لڑکی نے ایک اپنی ہوتی نگاہ اپنی چوکور جاتی ڈائل والی گھڑی پر ڈالتے ہوئے کہا
"اب سو کر کیا کروں گی۔"

سنان خاموش بیٹھا رہا۔
"کیا تم پہلی مرتبہ فرانس جا رہے ہو؟" اس نے گردن کو ہلکا ساخم دے کر سنان
کی جانب دیکھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بڑی معصومیت سے کہنے لگی "میں تو ہر
سال جاتی ہوں۔"

"آپ بھی اس بوڑھے سکاث کی طرح ہر ہفتے کیوں نہیں چلی جاتیں؟" سنان نے
یونہی ہائک لگائی۔

"کون سے بوڑھے سکاث کی طرح؟"
اپنا یار ہے۔ نیچے قوہ خانے میں بیٹھا، ہلکی پی رہا ہے۔"
لڑکی کی آنکھیں اب کے حیرت سے پھیل گئیں۔
بہر حال آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ ہر سال فرانس جاتی ہیں" سنان کا موڑ خاصا
بہتر ہو چکا تھا۔

”ہاں بالکل“ لڑکی پھر گواہ ہوئی ”وہ اس لیے کہ میرا باپ انگریز ہے اور مال فرانسیسی تھی۔“
”تھی؟“

”ہاں مرچکی ہے“

”حضرت ان غنوں پر—“

آنکھیں اور زیادہ سچیل گنیں کیوں کہ فقرہ اردو میں ادا ہوا تھا۔

”عجیب عجیب باتیں کرتے ہو“ لڑکی نے سر جھٹک کر کہا۔

”میں نے اپنی زبان میں افسوس کا اظہار کیا تھا“ سنان نے بڑی سمجھیگی سے کہا۔

”بمرحال آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ کی والدہ محترمہ وفات پا چکی ہیں۔“

اندوہنائک سانحہ کب ہوا تھا؟“

”تب میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے تو اس کی شکل بھی یاد نہیں۔“

”لیکن ہر سال فرانس جانے سے اس کا تعلق؟“

”ابھی بتاتی ہوں۔“ اس نے بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر پھر کہنا شروع کیا۔

”میری خالہ پیرس میں رہتی ہیں۔ ڈیڑی ڈیڑی مجھے گرمیوں میں ان کے پاس بیٹھتا

دیتے ہیں اور میں وہاں کرمس تک رہتی ہوں۔“

”یعنی ۲۵ دسمبر تک“ سنان نے لقہ دیا۔

”تمہارے ہاں کرمس کیا جوں میں ہوتی ہے؟“

”ہمارے ہاں کرمس سرے سے ہوتی ہی نہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا ”۲۵ دسمبر کا دن تو ہر ملک میں آنا“

ہے۔“

”ہاں، لیکن کرمس ہر ملک میں نہیں ہوتی۔ ہم مسلمان ہیں اور کرمس نہیں

مناتے۔“

”عجیب بات ہے“ اس نے ایک مرتبہ پھر سر جھٹکا ”میرا خیال تھا کہ کرمس نہام

مکبوں میں منائی جاتی ہے۔“

”ہاں تو آپ کہہ رہی تھیں۔“

”ہر مرجبہ بیچ میں ٹوک دیتے ہو۔ پوری بات ہی نہیں سنتے۔“

”جی“ نان نے سر جھکا لیا ”اب نہیں تو کوں گا۔“

”جانے میں کیا کہہ رہی تھی۔“ لڑکی نے منہ بنا کر کہا۔

”آپ کا باپ انگریز ہے۔ ماں فرانسیسی تھی۔ مرچکی ہے۔ خالہ پیرس میں کرمس۔“

”ہاں ہاں۔ تو میں کرمس تک پیرس میں رہتی ہوں اور پھر۔ پھر واپس نو تھم چلی جاتی ہوں۔ ویسے پیرس میں انگلستان کی نسبت سردی کا موسم قدرے گوارا ہوتا ہے۔ مجھے سردی بالکل پسند نہیں۔“

نان اب اس لڑکی معصوم باتوں میں بے حد دلچسپی لے رہا تھا۔ بے پناہ بے ساختگی تھی ان میں۔

”کہتے ہیں ہر انسان کے۔ ہر تہذیب یافتہ انسان کے دو ملک ہوتے ہیں۔ ایک اس کا اپنا اور دوسرا فرانس۔ آپ پر یہ روایت سونی صد صادق آتی ہے۔“

نان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”فرانس کی بجائے پیرس کہنا چاہیے۔ پیرس بے حد حسین شہر ہے۔ خاص طور پر دریائے سین اور اس کے خاموش کنارے جہاں میں ہیشہ شام ڈھلنے سیر کو نکل جاتی ہوں اور رات گئے تک اکیلی گھومتی رہتی ہوں۔“

”اکیلی؟“

”ہاں بالکل اکیلی!“

نان سوچنے لگا کہ پیرس جیسے شر میں اتنی حسین لڑکی کو لوگ اکیلے کیسے گھونٹے دیتے ہیں۔

محض کاذب کے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور جنگل کے اوپر رے سے لکتے ہوئے

تمہموں کی روشنی اب ماندھ پڑتی جا رہی تھی۔ سیئر کے گرد پھیلا ہوا سمندر جو پھیل
شب ایک ممیب غربت کی ماندھ پتلھاڑ رہا تھا اب ایک وسیع سرمنی صحرائی ماندھ
خاموش اور پر سکون لیٹا ہوا تھا۔ ہوا بھی تھم پچھی تھی۔ دور افق پر ایک ہلکی سی یہ
ابھری۔

”فرانس“ لڑکی نے لکیر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سنان کو چاتا۔

”ہاں فرانس۔ جس کی سرحدیں ہسپانیہ کو چھوٹی ہیں۔ ہسپانیہ میں انگلی
نام کا ایک صوبہ ہے جہاں قربطہ، شیلیہ اور غرباط جیسے پروفوسوں شروں کے ایوان اور
محراب میرے انتظار میں ہیں۔“

ہسپانیہ دیکھنے کے بعد تم کہاں جاؤ گے؟“

”گھر۔“

”اوہ گھر کہاں ہے؟“

سنان ہنس دیا۔ ”میں اپنا تعارف تو کروانا بھول ہی گیا۔ میں پاکستانی ہوں اور ایک
قدیم شرلاہور کا رہنے والا ہوں۔“

”کیا انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے تھے؟“

”میں کہیں بھی کسی غرض سے نہیں جاتا۔ لوگوں کے نزدیک بے مقصد آوارا
گردی جسے میں سیاحت کا نام دیتا ہوں۔ میں سیاح ہوں۔“

”سیاحوں کے نام بھی تو ہوا کرتے ہیں۔“

سنان کے لیوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”مجھے سنان کہتے ہیں۔“

”اوہ میرا نام پاسکل ہے۔“ لڑکی نے اپنا نخا منا ہاتھ آگے کر دیا۔ سنان کے
بھاری اور گرم ہاتھ نے اس کی ساری خنکی جذب کر لی۔

”میں نے اپنا ہاتھ ملانے کے لیے آگے کیا تھا تھامنے کے لیے نہیں۔“

”اوہ! سوری!“ سنان نے جلدی سے ہاتھ چھوڑ دیا۔

”تم کتنے خوش قسمت ہو جو آزادی سے گوم پھر سکتے ہو“ پاسکل کہہ رہی تھی۔

ہس میں خوش قسمتی سے زیادہ جذون کا ہاتھ ہے۔ سیاحت کا جذون جو فصل مگل آج ہی عود کر آتا ہے۔ دوستوں کی رائے میں ہر دوسرے تیرے سال میرا دماغِ آٹھ جاتا ہے اور میرے ذہن میں سحری وادیاں اور جملل جملل کرتی جھیلیں ابھرنے لگتی ہیں۔ پھر مجھ سے چلا نہیں بیٹھا جاتا اور میں چند تاریخ کی کتابیں اور مختصر سامان کاندھے پر رکھ کر اپنے شوق کی تیکھیل کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔“

ہماش میں بھی تمہاری طرح سامان کاندھے پر رکھ، پاسپورٹ جیب میں ڈال مزے سے دنیا کی سیاحت پر نکل سکوں” پا سکل نے اواس ہو کر کہا۔
”انتخار کس بات کا ہے یا کس کا ہے؟“

”انتخار ایک شہزادے کا ہے جو میرے بدن میں چبھی ہوئی سویاں نکال کر مجھے ازیں نیند سے بیدار کر دے“
نان کے پلے کچھ نہ پڑا۔

”میرے لیے تو یہ ایک دیوانے کا خواب ہے“ وہ بے حد آزر وہ نظر آرہی تھی۔
نان نے پہلی مرتبہ اسے غور سے دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں گھرے نیلے رنگ کی تھیں اور ستواں ناک سرے پر قدرے اپر کو اٹھی ہوئی۔ سرخ و سپید گول چہرے پر چھوٹے کٹے ہوئے بال بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ پچھلی شب کو تاریکی میں وہ اسے اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ یقیناً بے حد حسین تھی۔

نان نے سوچا اگر اس لڑکی کو مردانہ کپڑے پہنا دیے جائیں تو ایک نہایت حسین و جیل پسی لڑکا بن سکتی ہے۔

”صومیدار ول نواز خان کی بیانی ہوئی دو باتوں میں سے ایک تو پیرس کے بارے میں درست ثابت ہو گئی ہے۔ اب دیکھیں دوسری کا کیا بتا ہے!“ نان نے اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

پا سکل نے نان کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ پھر عجیب عجیب باقیں کر رہے ہو۔

”ہمارے گاؤں میں ایک ریٹائرڈ صوبیدار اس نام کا گزرا ہے۔“ سنان نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”وہ دوسری جنگ عظیم میں فرانس کے محاذ پر لڑا تھا۔ ہم بچپن میں گاؤں سے باہر اس کے ڈیرے پر چلے جاتے اور اس سے چیزوں کے بارے میں لکھنال سننے کی فرماںش کرتے۔ وہ ہیشہ دو باتوں کا ذکر کرتا کہ بیٹا چیرس کی تمام عورتوں کو آنکھیں نیلی ہوتی ہیں اور دہاں سرکیں شیشے کی بنی ہوتی ہیں۔“

پاسکل قدرے جھینپ گئی۔ ”کم از کم دوسری بات تو غلط ہے۔ شیشے کی بجائے چیرس کی اکٹھ سرکیں کھود رے پھرلوں سے بنی ہوئی ہیں۔“

”تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ پہلی بات درست ہے؟“

پاسکل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سنان کو مشرقی حیا کا یہ انداز مغرب میں دیکھ کر بے حریت ہوئی۔ درنہ کوپن بیگن کے توالی باغ میں تو ایک لڑکی نے اسے کھلے بندوں باہر میں جکڑ کر ”خوبصورت گذے“ کا خطاب دے ڈالا تھا۔ بے شرم کہیں کی لوگوں سا بڑی مشکل سے چھڑایا۔

”مجھے بھی بچپن میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں یا تو راجہ مہاراجہ ہوتے ہیں! فقیر، مُل کلاس سرے سے ناپید ہے۔ دونوں میں سے کوئی بات درست ثابت نہیں ہوئی۔“ پاسکل نے ہنس کر کہا۔

سانان اور پاسکل دہاں بیٹھے خاصی دیر تک یونہی باتیں کرتے رہے۔ وہ اسے چیزوں اور اس کے گرد نواح میں پھیلے ہوئے جنگلوں اور خوبصورت قبیوں کے بارے میں بتاتی رہی اور سنان اسے اپنے طویل سفر کے دوران میں پیش آنے والے دلچسپ واقعات سناتا رہا۔ کس طرح افغانستان کے وسیع صحراؤں میں وہ ایک حادثے سے دوچار ہوا اور اسے کئی روز ایک ویران کاروان سرائے میں گزارنے پڑے۔ بوف پوش کا آرات کا ذکر آیا جس کی چوٹی پر ایک روایت کے مطابق حضرت نوح کی کشتی لنگر انداز ہوئی تھی۔ اتنی بولی سے چند میل دور شہزادوں کے جزیرے میں ایک عجیب و غریب یونانی لڑکی سے ملاقات، سو ٹریز لینڈ کے بلند پہاڑوں میں ایک آسیب زده قبیلے میں قیام

سوین کی ایک جھیل کے کنارے چاندنی رات میں ایک بارہ سکنے سے مجبور، اور پھر
بیک قارٹ جرمی کی وہ چھوٹی سی ندی جہاں سے رومانوی دریائے ڈینیوب کا آغاز
ہوتا ہے۔

پاسکل شہری تلتے ہاتھ رکھے اس کی تمام باتیں بے حد و لمبپی سے سنتی رعنی۔ ہر
اپنی اور دور دراز کے ملک کے نام پر اس کا چھوٹا سرت سے دکھتا۔ سان جو
بعا خاموشی پسند واقع ہوا تھا آج بے حد باتیں کر رہا تھا۔ ایک قصہ ختم ہوتا تو پاسکل
منہ کھولے اس انتظار میں ہوتی کہ اب کسی اور انجانی جگہ کا تذکرہ چھڑے گا۔ آخر
میں سان اسے عمر خیام کے شرنیشاپور کے قدم قوہ خانوں میں کسی گئی لوک حکائیں
نانے لگا یہاں تک کہ ڈنکرک کے فرانسیسی شہر کی عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔ ان
دوں کے گرد تمام آرام کر سیاں اب مسافروں نے پڑھ ہو چکی تھیں۔ وہ ایک دوسرے
کی باتوں میں اتنے مگن رہے کہ انہیں احساس تک نہ ہوا کہ کب صبح ہوئی اور پھر
کب قوہ خانے میں بیٹھے ہوئے تمام مسافر اپر عرش پر آگئے۔ اکثر لوگ جنگلے کے
ساتھ لگ کر ڈنکرک کے شہر اور بندرگاہ کو دیکھ رہے تھے جو نزدیک سے نزدیک تر ہوتا
جا رہا تھا۔ سان اور پاسکل وہیں بیٹھے رہے۔

سان کو خیال آیا کہ ابھی یہ سیئر بندرگاہ میں داخل ہو جائے گا اور یہ خوبصورت
لڑکی یورپی لوگوں کی روایتی سردمیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہہ کر چل دے گی کہ
رفاقت کا شکریہ۔ خدا حافظ۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو۔

بندرگاہ میں داخلے پر سیئر کا بھونپو زور زور سے بجا شروع ہو گیا۔ جنگلے کے گرد
کڑے اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور اس کو نے کی
طرف چل دیئے جہاں بندرگاہ کو اتنے والی سیڑھی نصب تھی۔ سان نے پاسکل کی
 جانب دیکھا۔ وہ بڑے سکون سے اپنے سرخ کوٹ کے ایک بٹن سے کھینے میں مصروف
تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے ڈنکرک نہیں اترنا بلکہ یہ سیئر اسے کہیں اور لے جائے
گا۔